© rasailojaraid.com

محمد طفیل

برِّصغیر میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کا اِرتقاء

تعلیم ایک فن ہے جس کا مقصد قوم، معاشرہ اور فرد کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انسانی کردار کی صحیح تشکیل کرنا، اور ان کو قوم و ملّت کے لیے سُودمند، کارآمد اور مفید بنانا ہے تعلیم ہی کا یہ بھی مطمحِ نظر ہوتا ہے کہ انسان کے طبعی اور فطرتی رجحان کی نشان دہی کر کے اس کی منزل و مقصد کا تعیّن کرے، اور وسیع الفاظ میں یہ تعلیم ہی ہے جو انسان کو اپنی ماضی کی قدروں سے وابستہ رہ کر حال کے تقاضے، ضروریات اور اختراعات کو اپناتے ہوئے مستقبل کی لامتناہی عظیم اور اعلیٰ ترقی کی جانب رواں دواں رکھتی ہے۔

ان تمام ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے ایک ایسے مربُوط، مستحکم اور قدیم و جدید سے ہم آہنگ نظامِ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے جو کسی بھی قوم کی انفرادیت، یک جہتی اور بنیادی ضروریات کا آئینہ دار ہو جو اپنی وسعت کی بنا پر ایک جانب تو ماضی کے جملہ مفید نتائج کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے، اور دوسری طرف روزمرّہ کی سائنسی ترقی، صنعتی نشوونما، ذہنی پختگی کی نشوونما اور ہر نقطۂ انتہا سے آگے بڑھنے کی مکمل صلاحیتیں رکھتا ہو۔ اور اس نظامِ تعلیم کے مطالعہ سے نئی نسلیں شاندار ماضی کی روشنی میں مستقبل کی قدریں تخلیق کریں۔

اِن احساسات و ضروریات کی روشنی میں جب ہم اپنے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو وہ ہماری قومی ضروریات کے کسی بھی معیار پر پُورا نہیں اُترتا۔ نہ ہی وہ ماضی کا امین ہے، نہ حال کا رفیق اور نہ ہی مستقبل کی ترقیوں کا ضامن، نہ ہماری ملی انفرادیت کا مظہر ہے اور نہ ہی قومی و وطنی تقاضوں سے ہم آہنگ، بلکہ وہ ایک ایسا نیم جان اور مفلوج ڈھانچہ ہے جس کا ایک حصّہ صرف ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر رازِ زندگی پانے کی سعیِ لاحاصل میں مشغول ہے تو دوسرا حال کا پجاری، جبکہ تیسرا ان دونوں سے رشتہ ناطہ توڑ کر غلامی کی زنجیروں میں پھنس کر افیونی اور چرسی ملنگ کی طرح خارجی نشہ میں مست ہو کر ترقی کی تلاش کا دعویدار ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سطورِ بالا میں ہم نے اپنے نظامِ تعلیم کے جن تین پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے، اب ہم ان باہم دگر متحارب و متصادم اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے بُعد المشرقین نظاموں کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں، کیونکہ ان تینوں نظاموں کی خرابیوں اور نقائص کا جائزہ لینے کے بعد ہی ہم ان کی اصلاح کی عملی تدابیر پیش کر سکیں گے۔

تو آیئے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم پاکستان کے نظامِ تعلیم پر نگاہ ڈالتے ہیں چنانچہ سرسری جائزہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے ہاں مندرجہ ذیل تین قسم کے نظامِ تعلیم رائج ہیں۔

ا۔ انگریزی نظامِ تعلیم (Convent System Of Education) ایک ایسا نظامِ تعلیم ہے کہ جس میں غیر ملکی زبان یعنی انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے جس کے لیے ملک میں مخصوص ادارے قائم ہیں۔ ان اداروں کے اخراجات اور فیس کی شرح اس قدر زیادہ ہے کہ اس میں صرف اُمراء اور بورژوا لوگوں کے بچّے ہی تعلیم پا سکتے ہیں۔ کسی بھی غریب کے ہونہار، ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک بچہ کو صرف اس جُرم کی پاداش میں کہ وہ غریب کا بچّہ ہے، داخلہ نہیں مل سکتا۔

جب اس نظامِ تعلیم کے ثمرات و نتائج پر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ بچّہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی عیسائی بن چکا ہوتا ہے۔ پاکستان میں رہ کر غیر ملکی بن جاتا ہے۔ وہ اپنی شاندار روایات سے نابلد، اپنے قومی کردار و شعور سے عاری، اور معاشرے پر بوجھ بن جاتا ہے۔ جسے معاشرہ جب اپنی ضروریات کے لیے بروئے کار لانا چاہتا ہے تو اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہی اکابر کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتا ہے۔ انہیں جاہل، گنوار اور غیر مہذب (Uncivilized) قرار دیکر ان میں طرح طرح کے کیڑے نکالتا ہے۔ نتیجۃً معاشرہ طبقاتی کش مکش کا شکار ہو کر کبھی تو اشتراکیت اور مادہ پرستی میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ اور کبھی انسانی حدود و قیود کو پھلانگ کر اپنی ہی مل کے مالک کو ہلاک کر دیتا ہے، یا کم از کم اس سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔

ب۔ دیسی نظام (School System Of Education) یہ نظامِ تعلیم ہمارے ہاں عام ہے۔ اور ہمارے معاشرے کے اسّی پچاسی فیصد طلبہ اسی نظام کے تحت تعلیم پاتے ہیں۔ اس نظام کی تدریس ہمارے اپنے ملک کے افراد کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ اس نظام کا ذریعہ تعلیم بھی قومی زبان اُردو ہی ہے اور اس میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر اعلیٰ درجوں تک کسی قدر ہم آہنگی بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پائی جاتی ہے لیکن یہ نظامِ تعلیم بھی ہمارے قومی اور ملّی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا
یہ نظام انگریزی نظام کا خوشہ چین ہے، اور اسی سے روشنی مستعار لیتا ہے۔ ہمارے اکثر ماہرینِ تعلیم جو نظامِ الف کی پیداوار ہیں جب ہمارا نصاب ترتیب دیتے ہیں تو وہ اپنی ذہنی سطح اور تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ایسا ہی نظام ترتیب دے سکتے ہیں۔ جس میں ہر چیز انگریزی سے مستعار لی گئی ہو اور اس پر قومی زبان کی ملمّع سازی کر دی گئی ہو۔ ایسے افراد چونکہ ذہنًا قوم کے ساتھ نہیں ہوتے اس لیے قومی تقاضوں کو نصابِ تعلیم میں سمونے سے قاصر ہوتے ہیں۔

زیرِ بحث نظامِ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتا ہے جو اعلیٰ درجہ کے منشی تو ہو سکتے ہیں لیکن قومی رہنما نہیں، جو نقل اُتارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن تخلیقی قوتوں سے عاری، جو ملک و ملّت کے لیے رہزن، غدار اور جاسوس تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کے امین، نگہبان و محافظ نہیں جو درونِ ملک اور بیرونِ ملک اس کی بدنامی، رسوائی کا سبب ہو سکتے ہیں لیکن اس کی آبرومندی، نام آوری اور ترقی کے ضامن نہیں۔

دیسی نظامِ تعلیم کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس میں اسلام، نظریۂ پاکستان اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ یہ پاکستان، جو مذہب کے نام پر قائم ہوا تھا۔ اپنے ہی ملک کی نئی نسلوں میں اجنبی ہے۔ جدید پود کو اس سے قطعًا نا آشنا رکھا جا رہا ہے کہ پاکستان کی اصلی بنیادیں کیا ہیں۔ اور یہ قطعۂ زمین اَن گنت قربانیوں کے بعد کس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ ہمارا نظامِ تعلیم اپنے پس منظر میں نہ تو کوئی ٹھوس بنیادیں یا نظریات رکھتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی منزل متعین ہے۔ بلکہ ایسا بے پیندے کا لوٹا ہے جسے ہر حکومت اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرتی رہی ہے۔ کبھی ہم ایران کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی چین کی خوشامد، ہمارے خارجی تعلقات جس ڈگر پر چلتے ہیں۔ ہمارا نصابِ تعلیم انہی ناموں اور مکانوں کی پوجا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب ہم وہاں سے راندۂ درگاہ قرار پاتے ہیں اور ہمارے تعلقات ایک نیا رُخ اور نیا رُوپ دھار چکے ہوتے ہیں جبکہ ہم سیاسی میدان میں کسی نئی بساط کے مہرے ہوتے ہیں لیکن ہماری جدید نسل پرانی تعلیمی بساط پر ہی پِٹ رہی ہوتی ہے۔

اِس نظام میں ایک اور بڑی خرابی یہ ہے کہ نہ صرف بچّہ ذہنی طور پر تخلیقی قوتوں سے مفلوج ہو جاتا ہے بلکہ جسمانی نشوونما، جسمانی کرتبوں اور عسکری صلاحیتوں سے بھی محروم رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ نظام ابتداء میں اس قدر بھاری ہے کہ پانچویں چھٹے درجہ کا طالب علم اپنی کتابیں اور کاپیاں بمشکل اُٹھا پاتا ہے۔ اور پھر امتحانی نظام رہی سہی کسر پوری کر دیتا ہے۔ چنانچہ بچّہ کا وہ دَور جس میں اس کی تخلیقی قوتوں کو پروان چڑھنا ہوتا ہے، رٹّے کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اور کتابوں اور مضامین کی کثرت کی وجہ سے بچّہ کو سارا وقت پڑھنے میں گزارنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ جسمانی کرتب اور عسکری تربیت سے بھی محروم رہتا ہے۔ ہمارے ماہرینِ تعلیم نے تا حال اس ضرورت کو محسوس ہی نہیں کیا کہ عسکری تربیت ملک میں لازمی قرار دی جاتی تا کہ ہمارا ہر بچّہ قلم اور تلوار دونوں کا دھنی اور مجاہد ہو۔

ج۔ نظامِ مدرسہ Religious System Of Education ہمارے ملک کا یہ تیسرا نظامِ تعلیم ہے، اس سے مراد وہ تعلیم ہے جو مکاتب، مساجد اور دینی مدارس میں دی جاتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نظامِ تعلیم ہماری مذہبی ضروریات کا تو کفیل ہے اور ہمارے لیے مذہبی رہنما، خطباء، ائمہ اور مؤذنین پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس نظام پر رُہبانیت نے اپنا مضبوط تسلّط جما رکھا ہے۔ اور مسجد کے گنبد میں خطبہ یا اذان دینے والے لوگ دنیا و ما فیہا سے بے خبر اللہ اللہ کی تسبیح جپتے چلے جا رہے ہیں۔

دینی مدارس میں جو نصابِ تعلیم رائج ہے، اسے "درسِ نظامی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جسے بعض لوگوں نے نظام الملک طوسی (۴۸۵ھ) کی جانب منسوب کیا ہے۔ اور مولانا شبلی نعمانی نے مُلّا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ) کو اس نصاب کا مرتب قرار دیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ درسِ نظامی کو زمانۂ قدیم میں کسی بزرگ ـــ عام ازیں کہ وہ نظام الملک طوسی ہوں یا کوئی اور ـــ نے ترتیب دیا تھا۔ کیونکہ ہر ملک میں اپنی ضروریات کے مطابق نصابِ تعلیم مروّج رہتا ہے۔ جیسا کہ ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں مختلف ملکوں کے نظامِ تعلیم، کتبِ درس اور مدتِ تعلیم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تاہم ملا نظام الدین نے اس نصاب کا بغور جائزہ لیکر اسے اس برِ صغیر کی ضروریات کے مطابق ڈھالا، کیونکہ نصاب میں شامل اکثر کتب ہندوستانی مصنّفین کی تصنیف کردہ ہیں، جیسا کہ مولانا شبلی نے خود بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ درسِ نظامی ملا نظام الدین کی ترمیم کردہ شکل میں ہمارے ہاں مروّج ہے۔

اگرچہ ان دو صدیوں میں اس نصاب کی اصلاح کی متعدد کوششیں ہوئیں۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابوالمحاسن مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی - مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ جیسے جلیل القدر علماء نے اس نصاب پر نظر ثانی فرمائی، لیکن وہ لوگ اپنے طبعی دینی رجحان اور علوم جدیدہ سے عدم واقفیت کی بنا پر اس نصاب کو متحرک اور فعّال نہ بنا سکے۔ پچھلی دو صدیوں نے اقوام عالم اور ذہنی شعور نے جس برق رفتاری سے ترقی کی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس نصاب میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ اور واضح طور پر اس نصاب میں ایک خاص حد تک قدر مشترک رکھتے ہوئے اعلیٰ درجوں میں نصاب کو مختلف مضامین اور حصص میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اور ان حصص میں علوم جدیدہ کو مناسب جگہ ملتی تو یہی نصاب جو کسی وقت علم (Scholarship) کی اعلیٰ سند تھا اس دور میں یوں ادنیٰ درجہ نہ اختیار کر لیتا، اور اس کی پیداوار (Prodection) صرف مسجد کی ہی ہو کر نہ رہ جاتی۔

اس نصاب کی چند ایک کتب فارسی اور دیگر سب کی سب عربی زبان میں ہیں۔ چوبیس مختلف علوم و فنون پر اسّی کے قریب کتب شامل نصاب ہیں، جو ایک اندازے کے مطابق بڑے سائز کے ۱۸۴۲ صفحات پر مشتمل ہیں، جن میں تفسیر کے صفحات کی تعداد دو ہزار سے بھی کم ہے۔ جبکہ اس نصاب کا بنیادی مقصد قرآن مجید کو سمجھنا اور اس کے فہم کی صلاحیت پیدا کرنا قرار دیا جاتا ہے۔

یہ نصاب اس وقت بھی معمولی ترامیم و اضافوں کے ساتھ برصغیر کے دینی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے لیکن ہمیں سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معیار تعلیم بالکل گر چکا ہے۔ اس سارے نصاب کی تکمیل کی سند حاصل کرنے والا طالب علم ذہنی طور پر بالکل کورا بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کھو کر "ملّا آں باشد کہ چپ نشود" کا جیتا جاگتا نمونہ بن چکا ہوتا ہے۔ نہ وہ قرآن مجید کو سمجھ سکتا ہے نہ حدیث نبوی کے مطالعہ کا اہل ہوتا ہے۔ نہ اسے فقہی مسائل میں درک ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عربی ادب سے واقفیت رکھتا ہے۔ بلکہ ایسا جہل مرکب ہوتا ہے کہ وہ اپنے زعم میں اپنے سے زیادہ عالم اور کسی کو تسلیم نہیں کرتا حالانکہ وہ نماز و روزہ کے ابتدائی مسائل سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایسے خود ساختہ علماء جو علم کی دولت سے خالی ہوتے ہیں جب عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو معاشرہ میں طرح طرح کے مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ کبھی تو عام آدمیوں کی غلط رہنمائی کرتے ہیں، کبھی فروعی مسائل پیدا کر کے عوام کو لڑانے کی کوشش میں اپنے حلوے مانڈے کھرے کرتے ہیں، اور بسا اوقات دین کو اس قدر محدود کر کے بات کرتے ہیں کہ جدید ذہن اس سے متنفر ہو کر الحاد و بے دینی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے ہمارے ملک میں مروج نظامِ تعلیم کا مختصر سا خاکہ۔ جس میں ایک نسل تو ماضی کو، حال کو خیرباد کہہ کر اپنی قوم و ملت سے ناطہ توڑ کر دورِ غلامی کی یاد تازہ کرتے ہوئے اسی محبوب دلربا کی گود میں بیٹھنے کے لیے بے تاب اور کوشاں ہے، اور دوسری نسل نیمے دروں نیمے بیروں کی لذتوں سے آشنا تو پاک حقائق سے بے خبر وقتی مصلحتوں اور مقصد براریوں کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے جس کا نہ تو مقصد متعین ہے، نہ طریقۂ کار اور نہ ہی منزلِ مقصود، تیسری نسل ایک طرف تو "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم" کی رٹ لگا کر جدید علوم سے دامن چھڑاتے ہوئے ہے۔ اور ماضی کے جواہر پاروں کو توڑ توڑ کر انہیں بے کار ٹھیکرے بنا رہی ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں اور قوم کے وقت و دولت کو کند چھری سے ذبح کر رہی ہے۔

آئیے! اب ہم ذرا اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ وسیع خلیج جو کہ اس وقت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ حائل ہے۔ اور ہر نصاب ایک خاص طبقہ اور خاص لوگوں کے لیے متعارف ہو چکا ہے۔ کیا یہ ہمیشہ سے ایسا چلا آ رہا ہے، یا یہ کسی خاص دور، کسی خاص ذہن اور کسی خاص مقصد کی پیداوار ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہمارا دانا دشمن ہمیں بے وقوف بنا کر اب بھی اپنا مقصد حاصل کر رہا ہو؟

یہ ایک اہم اور ضروری سوال ہے۔ جس کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کے جھروکوں سے جھانکنا ہوگا۔ اگرچہ اس برصغیر میں اسلام اس وقت داخل ہوا جبکہ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمد بن قاسمؒ نے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے سرزمین سندھ کو مشرف فرمایا لیکن اسلامی تہذیب و ثقافت، علوم و فنون اور معیشت و معاشرت کو استحکام اس وقت نصیب ہوا جب محمود غزنوی جیسے مردِ آہن نے پورے برصغیر کو اپنے زیرِ نگیں کر کے اسلام کا پرچم بلند کیا۔ چنانچہ عہدِ سلاطینِ دہلی کے دور کے نصابِ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے خالد یار خان لکھتے ہیں:۔

"ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم قدرتی طور پر دینی تھا، جو کہ اسلامی ممالک میں عربوں نے رائج کیا تھا۔ عوام کی ابتدائی تعلیم کا مرکز مسجدیں تھیں۔ ابتدائی تعلیم کے یہ مرکز مکتب کے نام سے موسوم تھے۔ ان مکتبوں میں مسلمانوں کے لڑکے اور لڑکیاں دونوں دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ تعلیم قرآنِ پاک کے مطالعہ تک محدود تھی"۔ . . . ابھی اردو زبان نے جنم نہیں لیا تھا، اس لیے ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے علاوہ فارسی کی تعلیم، جو چاہتے تھے حاصل کر سکتے تھے، اس کے ساتھ تھوڑا سا حساب جو روزمرّہ کی زندگی میں کام آتے سیکھ لیتے تھے۔"

وہ آگے چل کر رقم طراز ہیں:

"ان ابتدائی تعلیمی اداروں کے علاوہ اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی تھے جو مدرسے کہلاتے تھے۔ ان مدارس میں تعلیمی زبان فارسی یا عربی تھی۔ دینی علوم میں فارسی و عربی کے علاوہ فقہ، حدیث اور تفسیر بھی پڑھائے جاتے تھے، اور ادب پر تعلیم بھی دی جاتی تھی طریقۂ تدریس عملی اور زبانی تھا۔"

سلاطینِ دہلی کے عہد کی تعلیمی ترقی اور نظام و نصابِ تعلیم کے بارے میں مفتی نظام اللہ شہابی اپنی کتاب "اسلامی نظامِ تعلیم کا چودہ سالہ مرقع" میں بھی چیدہ چیدہ باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ضیاء الدین برنی مصنّف تاریخ فیروز شاہی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "اس عہد میں علم بدیع و بیان، اصولِ فقہ، اصولِ دین، نحو، تفسیر وغیرہ کے بعض بہت بڑے علماء دہلی میں جمع تھے۔" اسی عہد کے بارے میں علامہ مقریزی کا خیال ہے، دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس تھے جس میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا۔ مدرسین کے لیے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں، علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاض کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اور اسی کی تائید صبح الاعشیٰ کے مصنف القلقشندی (م ۸۲۱ ھ) نے بھی کی ہے۔

عہدِ سلاطینِ دہلی کے دور کے تعلیمی خاکہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ نتائج اخذ کرتے ہیں:

(۱) نصابِ تعلیم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا تھا، ابتدائی اور اعلیٰ۔

(۲) ابتدائی تعلیم عام تھی۔ یہاں لڑکے اور لڑکیاں یک جا تعلیم پاتے تھے۔

(۳) ابتدائی نصابِ تعلیم قرآن مجید اور روزمرّہ کے لیے ضروری حساب کی تعلیم پر مشتمل تھا۔

(۴) اعلیٰ تعلیم کے لیے الگ مدارس قائم تھے جن میں یکساں نصاب رائج تھا۔

(۵) اعلیٰ تعلیم اس وقت کی مروجہ زبان فارسی یا عربی میں دی جاتی تھی۔

(۶) طریقۂ تعلیم یکساں تھا۔ یعنی نظریات (Theories) اور عملیات کی تعلیم دی جاتی تھی

(۷) تعلیم کا نظام حکومت کے زیرِ انتظام تھا۔ اور اساتذہ کو تنخواہیں سرکاری خزانہ سے ملتی تھیں۔

ان امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب ہم ذرا اور آگے بڑھتے ہیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کی عہد حکومت کے زریں دور یعنی مغلوں کے عہد کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی ہم اس بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر غور کریں گے کہ ہمارے ہاں پائی جانے والی موجودہ تفرقی کیا عہدِ مغلیہ کی پیداوار ہے، یا یہ لعنت کسی اور نے ہم پر مسلط کی۔

مختلف کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ مغلیہ کے ابتدائی دور میں تعلیمی ڈھانچہ میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ مکاتب و مدارس کا وہی نظام و نصاب رائج رہا۔ البتہ ضرورت کے مطابق مکاتب اور مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ نظامِ تعلیم آزاد تھا۔ اکثر مغل شہنشاہ مدرسوں کے اندرونی انتظامات یا تعلیمی معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتے تھے۔ مکاتب و مدارس ملک کی تعلیمی ضرورت کو بخوبی پورا کرتے تھے۔ کوئی بچہ۔ جس کو علم کا شوق ہو۔ علم سے محروم نہیں رہتا تھا۔

جہاں تک نصابِ تعلیم کا تعلق ہے تو وہ دینی اور دنیوی افادیت پر مبنی ہوتا تھا۔ اس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کے مضامین شامل ہو چکے تھے۔ طلبہ کو آزادی تھی کہ وہ اپنی دلچسپی کے مضامین کا انتخاب کریں۔ تدریس کے طریقے روایتی تھے، جن کا دارومدار حافظہ پر تھا۔ تعلیم محض لفظی یا کتابی نہیں تھی بلکہ اس میں عمل کو پورا پورا دخل تھا۔ اخلاقی اور دینی اصولوں پر نہ صرف شاگرد بلکہ اساتذہ بھی پورے پورے عمل پیرا ہوتے تھے۔ حصولِ تعلیم کے لیے طلبہ دور دور سے چل کر بڑے بڑے مدارس میں آتے اور اعلیٰ تعلیم پاتے تھے۔ ان طلبہ کو وظائف دیے جاتے تھے۔

البتہ اس عہد میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اکبر چونکہ اس بات کا بڑی شدت سے حامی تھا کہ اس برِصغیر میں ہندو مسلم قومیت کو ختم کر کے ان دونوں کے باہمی اختلاط سے ایک نئی قوم کو وجود بخشا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دیگر کوششوں کے ساتھ ساتھ اس نے ایک حکمنامہ جاری کیا جس کی رو سے محض دینی تعلیم کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی عقلی علوم جیسے نجوم، حساب، فلسفہ اور طب وغیرہ مدرسوں میں رائج کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ اکبر کے حکمنامہ کا متعلقہ حصّہ یہ ہے۔

"ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ اخلاق، حساب، زراعت، اقلیدس، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن، طب، منطق، طبیعیات، ریاضی، تاریخ وغیرہ علوم و فنون کی تعلیم بتدریج حاصل کرے۔ سنسکرت کے طلبہ کے لیے ویاکرن، نیائے، ویدانت اور پاتن جلی کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔ ہر طالب علم کے لیے موجودہ ضروریات اور مختلف علوم کی تعلیم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکبر کے اس فرمان نے اگرچہ تعلیم کے میدان میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ اور تعلیم ایک نئے دور میں داخل ہو گئی لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ مذہبی تعلیم ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ مذہبی تعلیم میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ چنانچہ اکبر کے امراء میں قلیچ خان کے بارے میں مآثر الامراء کا مصنف رقمطراز ہے۔

"قلیچ خان صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تسنن متعصب بود، ہمیشہ بدرسِ علوم و افادۂ طلاب اشتغال نمود، گویند کہ در صوبہ داری لاہور بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام می ورزید و باقصیٰ غایت در ترویج علوم شرعیہ می کوشید۔"

البتہ اکبر کی اس انقلابی تبدیلی کا ایک فائدہ ہوا کہ نصابِ تعلیم نہ صرف قومی امنگوں اور وقتی ضرورتوں کے مطابق ہو گیا، بلکہ اس میں یکسانیت کے ساتھ ایسی وسعت پیدا ہو گئی کہ اب وہ ہر ذہن کی ضرورت کے مطابق ہو گیا تھا۔ چنانچہ مستقبل کی تعلیمی پالیسی پر اس کے خوشگوار اثرات پڑے۔ اسی لیے عالمگیر کے عہد کے نظامِ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے سید ریاست علی ندوی رقم طراز ہیں۔

"عالمگیر کے دورِ حکومت سے پہلے ابتدائی مکاتب میں ہندو اور مسلمان طلبہ یکجا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان مکتبوں سے فارغ ہو کر مسلمان طلبہ اعلیٰ مدارس میں چلے جاتے اور ہندو طلبہ اپنے مذہبی مدرسوں میں جہاں شاستر کے علاوہ طب و نجوم وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔"

عہدِ مغلیہ کے نظامِ تعلیم سے ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے :

(۱) اس عہد کے ابتدائی دور میں سلاطینِ دہلی کے نظامِ تعلیم کو قائم رکھا گیا۔

(۲) نصابِ تعلیم میں یکسانیت پائی جاتی تھی اور سارے ملک میں ایک ہی نصابِ تعلیم رائج تھا۔

(۳) تعلیم جیسی بنیادی سہولت ہر شخص کو ملتی تھی۔

(۴) اکبر نے اپنے عہدِ حکومت میں چند نئے مضامین شامل نصاب کیے جو روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی سے متعلق تھے۔

(۵) ابتدائی مدارس میں ہندو مسلم طلبہ ایک ہی جگہ ایک ہی نصاب کی تعلیم پاتے تھے۔

(۶) ہر طالب علم اپنے ذوق اور صلاحیتوں کے مطابق مضامین کا انتخاب کر سکتا تھا۔

(۷) اعلیٰ مدارس میں مذہبی تعلیم، جو کہ ہندو مسلم کی الگ الگ تھی، کے علاوہ دیگر علوم میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۸) دینی علوم کے ساتھ ساتھ عقلی علوم — جنہیں دنیوی علوم قرار دیا گیا ہے — ان کا پڑھنا فرض تھا۔

(۹) تعلیم بالغاں کا بھی بندوبست تھا۔

(۱۰) تعلیمی اداروں کو معقول آزادی حاصل تھی۔

عہدِ مغلیہ کا یہ شاندار تعلیمی نظام بھی غیر ملکی لٹیروں کی نذر ہو گیا۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال اسی برِ صغیر میں انگریزوں کا ستارۂ عروج بن کر طلوع ہوا۔ جس نے نہ صرف مسلمانوں کے صدیوں پرانے دورِ حکومت کو ختم کر دیا، بلکہ ان کی تہذیب و تمدّن، طرزِ بود و باش اور تعلیم کو بھی بٹّہ لگایا اور اپنی ضرورت کے مطابق ایک ایسا نظامِ تعلیم وضع کیا جس کے نتیجہ میں مسلمان اپنے ماضی سے کٹ گئے۔

۱۷۰۷ء برِ صغیر کے لیے ایک اندوہناک سال ہے۔ کیونکہ اسی سال دورِ مغلیہ کے نامور حکمران اورنگ زیب نے داعئ حق کو لبّیک کہا۔ جس کے ساتھ مسلمانوں کی سلطنت کا پرچم ایسا رو بہ زوال ہوا کہ پھر کبھی نہ سنبھل سکا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت شدید بحران کا شکار ہو گئی۔ صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے چلے گئے۔ ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ ملک میدانِ کارزار کا منظر پیش کرنے لگا۔ جس سے معاشرے کے چیتھڑے اڑ گئے۔ سماجی انصاف، معاشرتی امن اور سکون کی زندگی تباہ ہو کر رہ گئی۔ ایسے دور میں کسی مربوط یا منظم تعلیمی نظام کا تصوّر بھی محال ہے۔ چہ جائیکہ وہ اپنی عملی صورت میں موجود ہے۔

برِ صغیر کی اس ابتری کو دیکھ کر یورپی اقوام جو کہ اس تاک میں بیٹھی تھیں۔ یکدم اس سونے کی چڑیا کو زیرِ دام کرنے کے منصوبے سوچنے لگیں۔ چنانچہ انگلستان کے تاجروں کی ایک جماعت جو پہلے سے ہی ہندوستان میں اپنا تسلّط جما رہی تھی۔ اس نے اس افراتفری اور دگرگوں حالات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اس وقت ہم سیاسی حالات یا ان کے نتائج و عواقب سے بحث نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اس تاجروں کے گروہ — جسے بعد میں East India Company کے نام سے یاد کیا گیا — کے تعلیمی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس تجارتی گروہ کو ملکہ الزبتھ نے ۱۶۰۰ء میں جو پہلا پروانہ اجازت (Charter) دیا تھا، اس میں ایک شق یہ بھی شامل تھی کہ کمپنی کے ملازمین کے بچوں کی دینی تعلیم کے لیے پادری وغیرہ رکھے جا سکیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مقصد کے لیے انگریز خالص مشنری اداروں کا نظام عمل میں لائے۔ اور چند سالوں کے عرصہ میں مدراس، بمبئی، بنگال وغیرہ میں مشنری ادارے قائم ہو گئے۔ جن کے اخراجات کی کمپنی کفیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی تھی۔ ان اداروں میں عیسائیت کی تعلیم و ترویج کے ساتھ انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اور جو نوجوان اِن اداروں سے فارغ التحصیل ہوتے انہیں کمپنی میں ملازمت کی سہولتیں مہیا کر دی جاتیں۔

انگریز بڑی دُور اندیش قوم ثابت ہوتے۔ انہوں نے اس موقعہ پر یہ محسوس کیا کہ اگر کمپنی نے صرف مشنری اداروں کی حوصلہ افزائی اور مالی امداد جاری رکھی تو ایک نہ ایک دن ہندوستانی باشندے اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونگے۔ اور شدید غم و غصہ کا اظہار کریں گے۔ جس کے نتیجہ میں ہمیں لازمًا ان تبلیغی اداروں اور اپنے بنل بچوں کو بند کرنا پڑے گا۔ انہوں نے اس مسئلہ کا یہ حل سوچا کہ ہندوستان میں ایسے ادارے بھی قائم کیے جائیں جو خالصتًا ہندوستانی ادارے ہوں اور ان میں یہاں کے علوم و فنون اسی ملک کی مروجہ زبانوں میں پڑھائے جائیں۔ چنانچہ اس سکیم کے تحت کلکتہ اور بنارس وغیرہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ کلکتہ کے مدرسہ میں مسلمانوں کے بچّوں کو عربی فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی اور مدارس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ فلسفہ قانون، ریاضی، منطق وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح سے پہلی بار بر صغیر دو گونہ نظامِ تعلیم سے متعارف ہوُا۔ اور یہیں سے نظامِ تعلیم کی یکسانیت ختم ہوئی، اور ہندوستان کی ثقافت و تہذیب نے موت کی جانب قدم اٹھایا۔

پھر ۱۸۱۳ء میں جب چارٹر کی تجدید ہوئی تو اس میں ایک یہ شق بھی شامل کی گئی تھی:

"ہندوستان کے گورنر جنرل اور مشاورتی کونسل کا یہ فرض ہوگا کہ ملکی آمدنی میں سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ احیاء و اصلاح ادب، ہندوستانی علماء کی ہمت افزائی اور برطانوی ہند کی رعایا کی ترقی پر صرف کریں۔"

مزید ہدایت یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو دنیوی تعلیم دی جائے۔ جس کے نتیجہ میں ایک جانب تو تبلیغی اور مشنری اداروں کی مالی امداد کو حکومت کی تائید و منظوری بصراحت حاصل ہوگی۔ اور یہ ادارے نئے جوش اور ولولے سے کام کرنے لگے تو دوسری طرف کمپنی کو ہندوستانیوں کی تعلیم کا ذمّہ دار ٹھہرا دیا گیا۔ اور اس تعلیم کی بنیادیں دنیوی علوم پر استوار کی جانے کی ہدایت تھی۔

جب کمپنی نے نظامِ تعلیم اپنے ہاتھ میں لیا تو اس وقت جن مسائل پر غور کیا گیا وہ یہ تھے:

(۱) تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

(۲) تعلیم کا بندوبست کون کرے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) تعلیم کی زبان کونسی ہو؟ اور

(۴) تعلیم کا طریقہ کونسا ہونا چاہیے؟

یہ چار ایسے بنیادی سوال ہیں جو اس وقت بھی ہمارے سامنے ہیں اور ان کا حل ہم تا حال تلاش نہیں کر سکے۔ اس لیے ان سوالوں کے جو حل اس وقت تجویز کیے گئے ہمیں ان کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاید کہ ہم بھی کوئی ایسا حل تلاش کر سکیں جو ہماری قومی اور ملی امنگوں کے مطابق ہو۔

جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے وہ صرف دو تھے کہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم کی تعلیم دی جائے، اور انگریزی زبان سکھائی جائے۔ تعلیمی بندوبست کو مخلوط رکھا گیا۔ مشنری اداروں اور دیسی مدرسوں کو قائم رکھا گیا۔ جہاں تک طریقۂ تعلیم کا سوال ہے اس کے لیے یہ طے کیا گیا کہ صرف اعلیٰ طبقہ کے بچوں کو تعلیم دی جائے۔ البتہ زبان کے مسئلہ پر بہت اختلافات ہوئے۔ اور آخر کار ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے یہ منوانے میں کامیاب ہو گیا کہ تعلیمی زبان انگریزی ہونی چاہیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام رقوم انگریزی ادبیات اور مغربی علوم پر خرچ ہونے لگیں۔ مشرقی تعلیم کو بٹہ لگانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ طلبہ کے لیے نئے وظائف اور مشرقی علوم کے لیے اساتذہ کے تقرر پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس طرح سے ہندوستانی اپنے ملک میں رہتے ہوتے اپنے علوم و فنون کو ترسنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی ہم اب ایک اور نظامِ مدرسہ کی جانب بھی متوجہ ہوتے ہیں جو کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ آریہ سماج میں بھی رائج رہا۔ اسے آریہ سماج میں گروکل کے نام سے یاد کیا جاتا جس کا مقصد صرف اپنے مذہب اور اپنے ادب و زبان کی تعلیم و اشاعت تھا۔ اس گروکل میں جو طلبہ داخل ہوتے ان سے عہد لیا جاتا کہ وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے۔ اور اپنی زندگی آریہ مذہب و زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے صرف کر دیں گے۔ ان اداروں میں چوبیس سال کی عمر تک تعلیم دی جاتی اور وہ نہایت سخت زندگی گزارتے تاکہ بعد میں جملہ سختیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

جب حکومت انگریزی نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو نصاب سے خارج کر دیا اور اپنی ساری توجہ عیسائیت کی تبلیغ اور انگریزی کی تعلیم کی جانب ہوگئی تو اس کا شدید ردِ عمل ہوا اور مسلمانوں نے نہ صرف اپنے عہدِ مغلیہ کے تعلیمی مکاتب اور مدرسوں کو بحال رکھا بلکہ وہاں سے ایسے علماء پیدا کیے جو انگریزی تعلیم اور علومِ جدیدہ کے ... حصول کو کفر جانتے تھے۔ اور ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون کرنا اپنے مذہبی احکام کے منافی خیال کرتے تھے۔ اس طرح ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا۔ جو صرف ماضی کے ساتھ ہی اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔

جس وقت کمپنی اپنے مشنری ادارے قائم کر رہی تھی۔ اور ہر جگہ انگریزی اور بقول ان کے جدید علوم رائج کر رہی تھی۔ اور دینی و مذہبی طبقے اپنے اداروں کو مذہبی تعلیم کے لیے مخصوص کر رہے تھے۔ اسی وقت ہندوستان میں تیسری قسم کے تعلیمی ادارے بھی کام کر رہے تھے جن کے متعلق تاریخ تعلیم کے مصنف لکھتے ہیں۔

"تیسری قسم کے اسکول جو کہ ملک میں رائج تھے۔ وہ ہندوستانیوں کے نجی سکول جن میں ابتدائی اور اعلیٰ دونوں قسم کی تعلیم کے اسکول تھے۔ اور ان دیسی اسکولوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ تھی۔ کمپنی نہ تو ان کو مالی امداد دیتی تھی اور نہ ان کو تسلیم کرتی تھی۔ غرضیکہ اس دور میں تین قسم کے اسکول قائم ہو گئے تھے۔ جو مختلف نظریات کے حامل تھے۔

مذکورہ تفصیلی جائزہ کے بعد اب ہم ان تینوں نظامہائے تعلیم کا اعادہ کرتے ہیں جو اس وقت ہمارے ملک میں رائج ہیں۔ اور جن کا تفصیلی ذکر ہم نے اوپر کیا ہے تو تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارا یہ نظامِ تعلیم اور تین مختلف انواع میں بٹا ہوا نصابِ تعلیم اس انگریزی دور کی پیداوار ہے جبکہ ہم اپنی قومیت اور ملت کو کھو چکے تھے۔ جب ہم پر غیر ملکیوں کی حکومت تھی۔ جب ہم مجبور تھے کہ اپنے حاکم کی زبان سمجھیں اور اسی کی زبان میں بات کریں جب ہمیں اپنی فریاد بھی غیر ملکی زبان میں پیش کرنا ہوتی تھی لیکن افسوس صد افسوس کہ اب ہم اپنے کو آزاد قوم گردانتے ہیں۔ اپنا آزاد وطن اور اپنے آزاد نظریات رکھتے ہیں، لیکن ہمارا نظامِ تعلیم آج بھی ایسی نسلیں تیار کر رہا ہے جو غلامی کی یادگار ہوں۔ جو اپنے قومی نظریہ، اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے مذہب و دین سے ناواقف اور نابلد ہوں۔

یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم غلامی کے دور سے الگ ہو کر اور سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے لیے ایک ایسا نصابِ تعلیم وضع کریں جو ہمیں مذکورہ دورِ سیاہ کی ذہنی، لاشعوری غلامی سے نجات دلائے۔ ہمارے لیے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیم کے مقاصد طے کریں کہ ان مقاصد کے لیے ہم نئی نسلوں کو تیار کریں گے۔ پھر ان کے حصول کے لیے جدید ترین تحقیقات کی روشنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں مسلسل جد و جہد کی جائے۔ تاکہ ہم جلد سے جلد نئی نسلوں کو اعلیٰ معیار پر لا سکیں۔ ہم ذیل میں چند مقاصد پیش کرتے ہیں جن کی روشنی میں نصابِ تعلیم کو ترتیب دے کر اسے مفید اور یکساں بنایا جا سکتا ہے۔

(۱) جدید نسل کو ہم سچے اور پکے مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔

(۲) بچوں کو دورِ حاضر کی ترقیات سے واقف رکھنا اور ان کے متعلق اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا۔

(۳) اسلام میں جدید تحریکات اور ان کے مقاصد اور کامیابیوں سے روشناس کرانا۔

(۴) ان طلبہ میں ایسی فکری صلاحیتیں پیدا کرنا کہ وہ نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تلاش کر سکیں۔

(۵) مذاہب کا تقابلی مطالعہ کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرنا۔

(۶) پاکستان کے نظریۂ قومیت اور پاکستان کی سالمیت و استحکام کے محافظ اور شیدائی بنانا۔

(۷) سائنس، صنعت و حرفت اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ایسی ترقی کرنا کہ ہم دنیا کے ممتاز ممالک میں شمار ہونے لگیں۔

(۸) ملت و قوم کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اعلیٰ درجہ کے محافظ اور جاں نثار پیدا کرنا۔

(۹) مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور اس کی ترویج و اشاعت کو جزوِ ذہن بنانا۔

(۱۰) سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ تعلیمات کسی ایسی زبان میں دینا جو اس خطّہ کے باشندوں کے ذہنوں اور ضروریات کے عین مطابق ہو تاکہ نئی نسل میں نسلی، لسانی یا صوبائی تعصّب نہ پیدا ہونے پائے۔

اب ہم آخر میں ان مقاصد کی روشنی میں اپنے نظامِ تعلیم کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اسے اپنا کر اپنے مقاصد کے نتائج کو دیکھ سکیں۔

ہم نے ابتدا میں جن مختلف نظامہائے تعلیم کا ذکر کیا تھا، ہماری رائے میں ان تینوں میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کی جائیں کہ ان میں سے پہلا یعنی انگریزی نظامِ تعلیم تو بالکل ختم کر دیا جائے اور دوسرے دونوں نظاموں کو ملا کر ایک خاص حد تک بالکل یکساں کر دیا جائے اور اعلیٰ درجوں میں ہر طالب علم اپنی پسند کے مضامین اختیار کر کے ان میں اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کر دے۔

ہماری رائے میں آٹھویں جماعت تک کا نصاب تمام مدارس میں — عام اس سے کہ ان کا تعلق دینی مدارس سے ہو یا اسکولوں سے — ایک ہی ہونا چاہیے۔ ان میں کتابوں کی بہتات نہیں ہونی چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ اُردو کی کتب ایسی جامع تیار کی جائیں کہ اُن میں مذکورہ مقاصد کو اس طرح سے سمو دیا جائے کہ بچّہ ایک ہی وقت میں زبان بھی سیکھے اور مقاصدِ تعلیم سے آگاہ بھی ہو۔ اس طرح سے ہم بچّوں کو بہت سی غیر ضروری کتابوں اور بہت سے غیر ضروری ذہنی بوجھ سے بچا سکیں گے۔

نویں اور دسویں جماعت میں حسبِ دستور مضامین کی تعداد زیادہ رکھی جائے اور طالب علم کو اختیار حاصل ہو کہ وہ ان مضامین میں سے جن کا اپنے لیے چاہے انتخاب کر لے۔ یہ نصاب بھی سارے ملک میں یکساں ہونا چاہیے۔ اور طلبہ کو اُردو کی کتب کے ذریعہ سے ہی سوچنے سمجھنے کی دعوت دی جائے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب اُردو کتب میں ایسے مقالات اور مضامین شامل کیے جائیں جو فکری ہوں۔ اور ہمارے متعیّنہ مقاصد کے آئینہ دار۔

دسویں جماعت میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد سے ہر طرح کی تعلیم کے لیے علیحدہ علیحدہ ادارے قائم ہونے چاہییں جیسے ادارہ برائے تعلیم صنعت و حرفت، ادارہ برائے تعلیم ادبیات و سرحری، ادارہ برائے تعلیماتِ ادبیات، ادارہ برائے تربیتِ جسمانی، ادارہ برائے تعلیم مذہب، ادارہ برائے تعلیم لسانیات وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے ادارے ہر بڑے شہر میں ضرورت کے مطابق قائم ہونے چاہییں، جن کی تعلیمی مدت چار سال ہو۔ ان چار سالوں میں سے پہلے دو سالوں میں طالب علموں کو تین مضامین پڑھائے جائیں لیکن سائنس کے طلبہ کے لیے ان کے ساتھ ایک اضافی مضمون بھی شامل ہو جو سارے مذکورۂ بالا مقاصد کی تعلیم دیتا ہو۔

آخری دو سالوں میں صرف دو مضامین لازمی شامل ہوں۔ اور ایک مضمون اضافی۔ ان سالوں میں ایسا نصابِ تعلیم مرتب کیا جائے جو طالب علم کے بالغ ذہن کو جلا بخشے اور اس کی قوتِ فکر میں معتدبہ اضافہ کر کے اسے آزادیٔ فکر کی دعوت دے۔

اس کے بعد مختلف مضامین کی سارے ملک میں ایک ایک جامعہ قائم کی جائے۔ ہماری رائے میں اس امر کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہر صوبہ میں ایک جامعہ قائم کی جائے۔ بلکہ تعلیم کا انتظام و انصرام مرکز کے پاس ہونا چاہیے۔ اور جس علم کی جس جگہ مناسب سمجھے ایک جامعہ قائم کر دے۔ ایسا کرنے سے ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ ملک بھر کا نصاب یکساں رہے گا اور دوسرے ایک منصوبہ پر ایک ہی جگہ کام ہو گا۔ اور کئی جگہ کام ہونے سے قوم کا جو وقت اور دولت ضائع ہوتی ہے اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچایا جاسکے گا۔

جامعات کی مدتِ تعلیم دو سال ہو گی جس میں طالب علم کسی ایک خاص مضمون میں مہارت حاصل کرے گا۔ اور اس مضمون کا نصاب اس قدر جامع مرتب کیا جائے کہ اس میں متعلقہ مضمون کے جملہ پہلو شامل ہوں اور اس کی مستقبل کی ترقی کا جائزہ بھی شامل ہو۔ اس تعلق سے دیگر علوم کی تشکیلِ نو میں ہماری رائے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئے گی۔ البتہ مذہبی تعلیم کے بارے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ہمارے خیال میں یہ کام مشکل تو ضرور ہے تاہم ناممکن نہیں۔

اس تعلق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ملک میں پائے جانے والے مختلف دارالعلوموں اور دینی درسگاہوں کے لیے یکساں نصاب مقرر کیا جاتے۔ ان تمام مدارس کا امتحانی نظام بھی ایک بورڈ کے سپرد ہو، جیسا کہ مشرقی پاکستان میں موجود رہا ہے۔ اور کسی بھی جامعہ یا جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو ایک مکمل جامعہ کا درجہ دے کر اس میں صرف یونیورسٹی کی سطح کی مذہبی تعلیم دی جائے۔

ہماری رائے میں اگر ہم ان خطوط پر اپنے نظامِ تعلیم کو ترتیب دیں تو نہ صرف ہم مختلف نظاموں سے نجات پا سکتے ہیں، بلکہ اپنے قومی و ملی مقاصد کے حصول کے ساتھ معیارِ تعلیم کو بھی خاصا بلند کر سکتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے دانشور، محقق اور مفکرین پیدا کر سکتے ہیں:

© rasailojaraid.com